ڈاکٹر محمد افضل حمید
استاد شعبۂ اُردو،گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

رابعہ رحمٰن
استاد شعبہ انگریزی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور۔

میراجی کا سماجی شعور

Dr. Muhammad Afzal Hamed
Associate Professor, Urdu Department, G.C. University Fasialabad.

Rabia Rehman

Teacher English Department, Islamia University Bahawalpur.

Social Conciousness of Meera Jee

Meera Jee is one of the prominent poet of 20th Century. He depicted self centered, narssist and Psychological issues in his poetry. Most of the critics present Meera Jee as introspective person. But Meera Jee has also focused socio economic issues in his writings. In this article effort is done to highlight that poetry which discusses the surroundings issues.

حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ شعرا میں سب سے اہم نام میراجی کا ہے۔ میراجی نے نہ صرف غیر ملکی کے شعرا کے مطالعے اور ترجمے سے جدید شاعری کے اصول وضع کیے بلکہ اردو نظم کو یورپ کی بیشتر ادبی تحریکوں یعنی علامت نگاری، تاثریت اور سرئیلزم سے بھی روشناس کرایا۔

ڈاکٹر یونس جاوید کی تحقیق کے مطابق میراجی ۲۵/ اگست ۱۹۴۰ء کو پہلی مرتبہ حلقے کے ایک اجتماع میں شریک ہوئے۔[۱] اس زمانے میں میراجی کے مضامین ادبی دنیا میں شائع ہو کر شہرت پا چکے تھے، لیکن وہ خود ادبی حلقوں میں نہ جاتے تھے۔ حلقہ اربابِ ذوق سے وابستگی نے حلقے میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میراجی کی گفتگو میں ایسی عالمانہ شان ہوتی کہ ان کی تنقیدات کے جملے لوگ یاد رکھتے تھے۔

میراجی کی شاعری پر کارل مارکس یا ان کے پیروکاروں کے اثرات نظر نہیں آتے، کہیں کہیں ردِ عمل ضرور ملتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے منشور نے ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیکن میراجی کے ذہنی رجحانات کو ان کی شاعری کے آئینے میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کو جنت کا نمونہ بنانے کے لیے ان کا نسخہ یہ ہے کہ انسان تنگ نظری کو ترک کر دیں:

ذہنی رفعت پر بھولے ہو ، ذہنی رفعت اِک دھوکا ہے!
ہے جسم کی ہر اک رگ میں خوں، خوں میں حرکت، یہ دھند ہے!
اک دام جہالت پھیلا ہے ، کیوں اس میں گھرے ہو؟ اب نکلو!
جب وقت کی حد پوری ہو گی تب وقت نہ ہو گا ، اب سمجھو!
تہذیب و تمدن کے جھوٹے رنگوں پہ نہ جاؤ ، مت بھولو!
نقصان بہانے میں لاکھوں پوشیدہ ہیں ، اِتنا جانو!
دورنگی چھوڑو دو رنگی ، یک رنگ اصولوں پر چل کر!
یہ دنیا جنت بن جائے گی سچی باتوں میں ڈھل کر!(۲)

۱۹۴۰ء میں میراجی نے "ترقی پسند ادب" کے عنوان سے جو نظم تحریر کی وہ ان کے ادبی نصب العین کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس میں ترقی پسندوں کو سمجھاتے ہیں کہ لوگ انقلاب کے نعروں سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ پریم کتھا سننے کے خواہش مند ہیں:

دل کا اُجالا بنسی والا میٹھی جس کی بانی ہے
بنسی دُھن کی بات نہ کہنا یہ تو پرانی کہانی ہے
اب تو ساری دنیا بدلی ہر صورت انجانی ہے
دل میں سب کے چھایا اندھیرا ظاہر ہی نورانی ہے
یہ بھی رُت ہے مٹ جائے گی ، ہر رُت آنی جانی ہے
اتنی بات کہ دل بے چین رہے جگ میں لافانی ہے(۳)

انسان سماجی حیوان ہے، اپنی معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خود فراموشی کے مرحلے تک جا پہنچا ہے لیکن کیا وہ اپنے جبلّی اور فطری تقاضوں سے صرفِ نظر کر سکتا ہے، میراجی سوال اُٹھاتے ہیں:

دل بے چین ہو ارادھا کا کون اسے بہلائے گا؟
جمناتٹ کی بات تھی ہونی، اب تو دیکھا جائے گا
چنچل سہے گی رنگ وہ رادھا جو بھی سر پہ آئے گا
اودھوشیام پہیلی رہتی دنیا کو سمجھائے گا
پریم کتھا کا جادو سننے والوں کے دل پہ چھائے گا
یہ توبتاؤکون سورما اب کے ہاتھ لگائے گا؟(۴)

''اس نظم میں'' کے دیباچے میں میراجی ۱۹۴۱ء میں ادبی دنیا کے لیے لکھے گئے ایک مضمون کا اقتباس دیتے ہیں جس میں انہوں نے زندگی اور ادب کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہا تھا:

''ادب زندگی کا ترجمان ہے اور ظاہر ہے کہ ہماری زندگی ماہ بماہ نہیں تو سال بہ سال ضرور بدلتی جارہی ہے اور یوں نہ صرف سماجی اور اقتصادی حالات ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی طور پر بھی خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات ادب اور آرٹ بھی جہاں فن کاری کے نئے اسلوب قائم کرنے کا باعث ہوئے ہیں وہاں اخلاقی لحاظ سے بھی ایک جدید انداز نظر قائم ہوتا جارہاہے۔''(۵)

محمد صفدر میر نے ۳۰جون ۱۹۹۱ء کو حلقہ اربابِ ذوق کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطبہ کے دوران میں میراجی کے مقالے ''نئی شاعری کی بنیادیں'' کے ایک اقتباس میں اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک کے متعلق ان کے افکار کو پیش کیا تھا جس میں انہوں نے غلط اور صحیح ترقی پسندی کا فرق نمایاں کرتے ہوئے کہا تھا:

''گزشتہ پانچ سات سال میں اُردو ادب میں سب سے زیادہ توجہ کے لائق جو تحریک چھڑی ہے وہ ترقی پسند ادب کا نظریہ ہے۔ لیکن فیض کے ایک عنوان سے الفاظ مستعار لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس خواب کو کثرت تعبیر نے پریشان کر دیا ہے۔۔۔ اس تحریک کے اولین علم برداروں کی پہلی اور بنیادی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ترقی پسند ادب کو محض اشتراکی جمہوریت کا ہم معنی سمجھا اور یوں اپنی انتہا پسندی کے باعث صرف ایک نئی قسم کے اذیت پرستانہ ادب کے سمجھانے والے بن کر رہ گئے۔ حالانکہ ہر اس ادبی تخلیق کو ترقی پسند کہا جا سکتا ہے جو خیال افروز ہو اور ذہنی اور جسمانی زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہمیں کم از کم ایک قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر دے۔''(۶)

میراجی کے یہ افکار ان کے تاریخی اور عصری شعور کے غماز ہیں۔ میراجی نے زندگی میں بے پناہ معاشی پریشانیاں دیکھیں۔ افلاس میں آنکھ کھولی اور شراب نوشی اور بے نیازانہ طبیعت کے باوصف کسبِ معاش کے کسی موزوں ذریعہ کو اختیار نہ کر سکے۔ ان کی شاعری عموماً نا آسودہ جذبات کی ترجمان ہیں۔ ''کلرک کا نغمۂ محبت'' طبقاتی تفاوت کا شکار ایک کم آمدن والے انسان کی داخلی کیفیات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم میں ایک کلرک کی کہانی بیان کی گئی ہے جو صبح کے وقت بیدار ہو کر گزشتہ روز کی بچی ہوئی آدھی ڈبل روٹی کھا کر ناشتہ کرتا ہے اور دفتر کی راہ پر پیدل چلتا جاتا ہے۔ راستے میں شہر کی رونق ہے ایک تانگہ اور دو کاریں بھی نظر آتی ہیں۔ تانگے میں سوار لڑکیوں کو دیکھ کر اس کے دل میں محبت کے جذبات ابھرتے ہیں مگر اپنے آپ کو بدقسمت اور مغموم تصور کرتے ہوئے وہ کلرک اپنے دل کو طرح دے کر دفتر میں آکر کام کاج میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کلرک کا افسر دوپہر کو آکر کلرک پر رعب جماتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاش وہ بھی ایک افسر ہوتا اور تانگے میں بیٹھی اس کی محبوبہ اس کی رفیقۂ حیات بن کر اس کے ہمراہ ایک آسودہ زندگی بسر کرتی:

''جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپڑاسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے، ووں کہتا ہے لیکن بے کار ہی رہتا ہے
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لیے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں
اور دل میں آگ سلگتی ہے میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا اور تو ہوتی''(۷)

نظم ''اجنتا کے غار'' میں میراجی کا سماجی شعور صاف جھلکتا ہے۔ بظاہر وہ مارکسی فلسفہ کے پیروکار نہیں ہیں لیکن بھکاری کی بھوک اور پیاس انہیں بھی نظر آتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پانی پینے کو نہ بھی ملے، دیوداسی کی یاد ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی:

میلے کپڑوں کی طرح لٹکی ہوئی تصویریں
بیتے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں
کئی راجہ ہیں یہاں ایک ہی راجہ بن کر
ایک ہی تاج کے ہیرے ہیں کئی ہیرے ہیں
راج دربار ہو یا راج بھون ہو، دونو

ایک خوشبو سے بسے ہیں وہی گرمیٔ خوشبو
جس نے دیوانہ بنایا ہے بھکاری کو مدام
بھید لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا ہے
اس کی نظروں کو دیا ہے دھوکا
بھوک نے پیاس نے--- (کیا کہتے ہو
جسے تم پیاس سمجھ بیٹھے ہو
وہ بھی اک بھوک ہے اب --- جان لیا
میں فقط پوچھتا ہوں
پانی پینے کو نہیں ملتا تو کیا--- ایک لنگوٹی تن کی
داسی کی یاد نہیں لاسکتی؟ (۸)

"اے دوست کبھی لاہور نہ آنا" میں ان ٹیکسز اور محصولات پر طنز کی ہے جو حکومت، عامتہ الناس سے کسی نہ کسی بہانے سے اینٹھتی رہتی ہے:

سائیکل پہ اگر تو بیٹھے گا
اور لیمپ نہ آگے رکھے گا
گر دِن بھی ہو ، وردی والا
ہر موڑ پہ تجھ کو روکے گا
اور بولے گا چالان لکھا
اے دوست کبھی لاہور نہ آ
گر متبسم ہو تو ایک آنہ
ہو جائے گا تجھ کو جرمانہ
ر کھل کے ہنسے تو دو آنے
تفریح بھی نہیں بس میں اپنے
یاں سینما پر ہے ٹیکس لگا
اے دوست کبھی لاہور نہ آ(۹)

"گیت ہی گیت" میں شامل "لوک گیت" کو پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میرا جی خارج کی دنیا سے بے نیاز بھی نہیں رہے ہیں۔ "لوک گیت" تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں شاعر ذات پات کے اختتام اور نئے زمانے کی شروعات کا اعلان کرتا ہے:

"ذات پات کو مارو گولی
ذات پات کی دُنیا ہولی
اب ہے نیا زمانہ
چھوڑو رونا رُلانا
بیتی بات فسانہ
خواب میں سنی کہانی
دقیانوسی بانی،
جگ میں ہر شے آنی جانی،
ہم نے مانا"(۱۰)

گیت کے دوسرے حصے میں شاعر عالمی جنگ و جدل اور خونی فسادات کا ذکر کرتا ہے۔ جنہوں نے نظام زندگی کو تلپٹ کر کے چھوڑا ہے۔

"دھک دھک دھک جلے الاؤ
جو بویا وہی کاٹو کھاؤ
پھوٹ پڑی سچائی
سب ہیں بھائی بھائی
مرنے کو ہے قصائی
پیچھے پھر پچھتاؤ
گھر میں بیٹھا بنیا روے آؤ مجھے بچاؤ
رام دہائی"(۱۱)

ترقی پسند شاعروں کی طرح میراجی کو بھی یقین ہے کہ محرومیوں کے گھاؤ بھرنے والے ہیں کیونکہ محنت کش اور مزدور اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور نظام کہن کے خلاف اعلانِ بغاوت کر چکے ہیں:

"بھید نہیں کوئی بھول بھلیاں
اب کوتوال بھئے ہیں سیاں
ایسی ریت جگت کی
مانو بات ہے مت کی
کہتے ہیں ہم ست کی
مٹنے کو ہیں گھاؤ،
گلیوں میں مزدور پکارے مارو! لوٹو! کھاؤ
آؤ آؤ(۱۲)

وزیر آغا نے میراجی کی نظموں میں اجتماعی لاشعور کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے مضمون "میراجی ــــ دھرتی پوجا کی ایک مثال" میں لکھتے ہیں:

"میراجی نے ایک بھگت، درویش یا جان ہار پجاری کی طرح اپنی دھرتی کی پوجا کی ہے۔ محض رسمی طور پر وطن دوستی کی تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں کی روح، فضا اور مزاج ارضِ وطن کی روح، فضا اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔"(۱۳)

شمیم حنفی نے بھی یہی رائے دی تھی کہ :

"میراجی کی خیال پرستی، ارضی ماحول اور تہذیبی ورثے سے وابستگی کا ایک روپ ہے۔"(۱۴)

میراجی کی شاعری کو عموماً داخلی وارداتوں کا بیان سمجھا گیا ہے لیکن ڈاکٹر رشید امجد نے ان کی نظموں کے بارے میں جو رائے دی وہ بہت متوازن ہے۔ لکھتے ہیں:

"میراجی کے یہاں صرف ان کی ذات، ان کا لاشعور اور ان کی مابعد الطبیعات ہی مختلف زاویوں سے منعکس نہیں ہوتی بلکہ ان کی ذات کا آشوب اپنے عصری آشوب کو اپنے اندر سمیٹ کر ان کی نظموں کو ہمہ جہت بناتا ہے۔ میراجی کے موضوعات زندگی کی متنوع جہات کا احاطہ کرتے ہیں اور ان کے رنگ پوری زندگی کی لہروں سے جنم لیتے ہیں۔"(۱۵)

میراجی کے طبعی میلانات تو انھیں انسانی نفسیات کے مطالعہ کی تحریک دیے رکھتے ہیں، لیکن کوئی شاعر، ادیب، نغمہ گر اپنے معاشرتی مسائل سے کٹ کر نہیں رہ سکتا چاہے وہ کتنا ہی لااُبالی، بے نیاز، خود مست یا خدا مست کیوں نہ ہو۔

حوالہ جات

۱۔ یونس جاوید، ڈاکٹر، حلقہ ارباب ذوق، تنظیم تحریک نظریہ، دوست پبلی کیشنز اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶

۲۔ میراجی، کلیات میراجی، مرتب: ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو مرکز، لندن ۱۹۸۸ء، ص ۴۴۶

۳۔ ایضاً، ص ۷۸

۴۔ ایضاً، ص ۷۸

۵۔ میراجی، اس نظم میں، ساقی بک ڈپو دہلی، ۱۹۴۴ء، ص ۱۱

۶۔ محمد صفدر میر، ادب اور زندگی، مشمولہ: ادب، زندگی اور سیاست، مرتب: محمد خاور نوازش، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۲، ص ۲۰۰

۷۔ میراجی، کلیاتِ میراجی، ص ۱۲۴۔۱۲۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔۱۷۸

۹۔ ایضاً، ص ۴۸۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۶۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۷۰۔۶۶۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۷۰

۱۳۔ وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلشرز، لاہور ۲۰۰۷ء، ص ۵۶۔۵۵

۱۴۔ شمیم حنفی، نئی شعر روایت، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ص ۵۸

۱۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میراجی شخصیت اور فن، مثال پبلشرز، فیصل آباد مئی ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۹۔۱۴۸